تلخیاں

ساحر لدھیانوی

Some Pages are missing

ساحر لدھیانوی

تلخیاں



ناشر:
پنجابی پستک بھنڈار
دریبہ کلاں - دلی ۶

پندرھواں ایڈیشن
مارچ ۱۹۶۳ء

قیمت تین روپے صرف

طابع:
پریم ہنس پریس - دلی

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر

ترتیب

ابتدائیہ

"تلخیاں" کا زیر نظر ایڈیشن جو پنجابی پستک بھنڈار کے ذریعے آپ تک پہنچ رہا ہے، اس مجموعے کا پندرھواں ایڈیشن ہے، قریب قریب اتنے ہی، یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ، اس کتاب کے جعلی ایڈیشن چھپ چکے ہیں، جو آج بھی دکانوں پر فروخت ہو رہے ہیں،

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن، تقسیم ہند سے تین، ساڑھے تین برس قبل پریت نگر بک شاپ لاہور سے شائع ہوا تھا، جو چھوٹے سائز

کے ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل تھا، میں اُس وقت طالب علم تھا، اور مجھے یہ قطعاً امید نہیں تھی، کہ اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن چھپنے کی نوبت آئے گی۔ اسے قارئین کی فراخدلی کہنا چاہئے، کہ اس مجموعے کی مانگ ابھی تک باقی ہے،

حسبِ سابق، اس بار بھی یہ مجموعہ قدرے ترمیم اور اضافے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، نظموں کی ترتیب کم و بیش وہی ہے، جس ترتیب سے یہ لکھی گئیں، سوائے 'پرچھائیاں' کے، جو آخری چند نظموں سے پہلے لکھی گئی تھی، مگر طوالت کے خیال سے آخر میں شامل کی گئی ہے،

میں اپنے تمام پڑھنے والوں کا شکرگزار ہوں، جن کی محبت اور سرپرستی کے باعث، یہ مجموعہ بار بار چھپ رہا ہے،

ساحر لدھیانوی

چنائی نواس،
اندھیری، بمبئی

۲۶ جنوری ۶۳ء

ردِّ عمل

چند کلیاں نشاط کی چُن کر
مُدّتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مِل کر اُداس رہتا ہوں

••

ایک منظر

افق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی، راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر
جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اُٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے
پُراسرار لَے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
وہ دُور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصوّر میں لاکھوں دِیے جھلملائے

٥٥

ایک واقعہ

اندھیاری رات کے آنگن میں صبح کے قدموں کی آہٹ
یہ بھیگی بھیگی سرد ہوا، یہ ہلکی ہلکی دھندلاہٹ
گاڑی میں ہوں تنہا محوِ سفر اور نیند نہیں ہے آنکھوں میں
بھولے بسرے رومانوں کے خوابوں کی زمیں ہے آنکھوں میں
اگلے دن ہاتھ ہلاتے ہیں، پچھلی بیتیں یاد آتی ہیں
گم گشتہ خوشیاں آنکھوں میں آنسو بن کر لہراتی ہیں
سینے کے ویراں گوشوں میں ایک ٹیس سی کروٹ لیتی ہے
ناکام اُمنگیں روتی ہیں، اُمّید سہارے دیتی ہے
وہ راہیں ذہن میں گھومتی ہیں جن راہوں سے آج آیا ہوں
کتنی اُمید سے پہنچا تھا، کتنی مایوسی لایا ہوں!

●○

یکسوئی

عہدِ گم گشتہ کی تصویر دکھاتی کیوں ہو؟
ایک آوارۂ منزل کو ستاتی کیوں ہو؟
وہ حسیں عہد جو شرمندۂ ایفا نہ ہوا
اُس حسیں عہد کا مفہوم جتاتی کیوں ہو؟
زندگی شعلۂ بے باک بنا لو اپنی
خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو؟

میں تصوّف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو؟
کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو؟
ایک سرکش سے محبت کی تمنّا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو؟
میں سمجھتا ہوں تقدّس کو تمدّن کا فریب
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو؟
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟
تم میں ہمّت ہے تو دُنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

●○

شہکار

مصوّر! میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں
اب اِن رنگین رُخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے
لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں کو مضمحل کر دے
نمایاں رنگِ پیشانی پہ عکسِ سوزِ دل کر دے
تبسّم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدگی بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اُٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دیدے
نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دیدے
مگر ہاں بینچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں — میری بجائے اِک چمکتی کار دکھلا دے

غزل

محبّت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے
ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے
اُنہیں اپنا نہیں سکتا، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مُدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے
بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بے کار اُمیدو!
بہت دُکھ سہہ لیئے میں نے، بہت دن جی لیا میں نے

نذرِ کالج

(لدھیانہ گورنمنٹ کالج ــــ ۱۹۴۳ء)

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام
اے وادیٔ جمیل! مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تری بارگاہ میں
تو آج بھی ہے میرے لئے جنتِ خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال
کمھلائے ہیں یہاں پہ مری زندگی کے پھول
ان راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پھول
تیری نوازشوں کو بھُلایا نہ جائے گا
ماضی کا نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا
تیری نشاط فضائے جواں کی خیر
گلہائے رنگ و بو کے حسیں کارواں کی خیر

دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھلی رہیں
تا حشر یہ حسین فضائیں بسی رہیں
ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے حدِّ وطن سے نکل گئے
گائے ہیں اِس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی
سرکش بنے ہیں، گیت بغاوت کے گائے ہیں
برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں
نغمہ نشاطِ روح کا گایا ہے بارہا
گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا
معصومیوں کے جُرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے
اس سرزمیں پہ آج ہم اِک بار ہی سہی
دُنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم اِن فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں ○○

غزل

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے

اے آرزو کے دُھندلے خرابو! جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے

تجھ کو خبر نہیں، مگر اِک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

میں، اور تم سے ترکِ محبّت کی آرزو!
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اب اے دلِ تباہ! ترا کیا خیال ہے؟
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

●○

معذوری

خلوت و جلوت میں تم مجھ سے ملی ہو بارہا
تم نے کیا دیکھا نہیں، میں مُسکرا سکتا نہیں
میں، کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں
مجھ میں کیا دیکھا کہ تم اُلفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں
روح افزا ہیں جنونِ عشق کے نغمے، مگر
اب میں ان گائے ہوئے گیتوں کو گا سکتا نہیں

میں نے دیکھا ہے شکستِ سازِ اُلفت کا سماں
اب کسی تحریک پر بربط اُٹھا سکتا نہیں
دل تمہاری شدتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں
تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
میں تمہارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں
گائے ہیں میں نے خلوصِ دل سے بھی اُلفت کے گیت
اب ریاکاری سے بھی چاہوں تو گا سکتا نہیں
کس طرح تم کو بناؤں میں شریکِ زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اُٹھا سکتا نہیں
یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دو مجھے
اب میں شمعِ آرزو کی لَو بڑھا سکتا نہیں

••

خانہ آبادی

(ایک دوست کی شادی پر)

ترانے گُونج اُٹھے ہیں فضا میں شادیانوں کے
ہَوا ہے عطر آگیں، ذرّہ ذرّہ مسکراتا ہے
مگر دُور ــــ ایک افسردہ مکاں میں سرد بستر پر
کوئی دل ہر کہ ہر آہٹ پہ یوں ہی چونک جاتا ہے
مری آنکھوں میں آنسو آگئے "نادیدہ آنکھوں" کے
مرے دل میں کوئی غمگین نغمہ سرسراتا ہے
یہ رسمِ انقطاعِ عہدِ اُلفت، یہ حیاتِ نَو
محبّت رو رہی ہے اور تمدّن مُسکراتا ہے
یہ شادی، خانہ آبادی ہو میرے محترم بھائی!
"مُبارک" کہہ نہیں سکتا، مِرا دل کانپ جاتا ہے

٥٥

سرزمینِ یاس

جینے سے دل بیزار ہے ہر سانس اک آزار ہے
کتنی حزیں ہو زندگی اندوہ گیں ہے زندگی
وہ بزمِ احبابِ وطن وہ ہم نوایانِ سخن
آتے ہیں جس دم یاد اب کرتے ہیں دل ناشاد اب
گذری ہوئی رنگینیاں کھوئی ہوئی دلچسپیاں
پہروں رُلاتی ہیں مجھے اکثر ستاتی ہیں مجھے
وہ زمزمے وہ چہچہے وہ روح افزا قہقہے
جب دل کو موت آئی نہ تھی یوں بے حسی چھائی نہ تھی

کالج کی رنگیں وادیاں — وہ دل نشیں آبادیاں
وہ نازنینانِ وطن — زہرہ جبینانِ وطن
جن میں سے اِک رنگیں قبا — آتش نفس، آتش نوا
کر کے محبّت آشنا — رنگِ عقیدت آشنا
میرے دلِ ناکام کو — خوں گشتۂ آلام کو
داغِ جُدائی دے گئی — ساری خدائی لے گئی
ان ساعتوں کی یادیں — ان راحتوں کی یادیں
مغموم سا رہتا ہوں میں — غم کی کسک سہتا ہوں میں
سُنتا ہوں جب احباب سے — قصّے غمِ ایّام کے
بیتاب ہو جاتا ہوں میں — آہوں میں کھو جاتا ہوں میں
پھر وہ عزیز و اقربا — جو توڑ کر عہدِ وفا
احباب سے مُنہ موڑ کر — دُنیا سے رشتہ توڑ کر
حدِّ افق کے اس طرف — رنگِ شفق کے اس طرف
اِک وادیِ خاموش کی — اِک عالمِ بے ہوش کی
گہرائیوں میں سو گئے — تاریکیوں میں کھو گئے
اُن کا تصوّر ناگہاں — لیتا ہے دل میں چٹکیاں

اور خوں رُلاتا ہے مجھے — بے کل بناتا ہے مجھے
وہ گاؤں کی ہمجولیاں — مفلوک دہقاں زادیاں
جو دستِ فرطِ یاس سے — اور یورشِ افلاس سے
عصمت لُٹا کر رہ گئیں — خود کو گنوا کر رہ گئیں
غمگیں جوانی بن گئیں — رُسوا کہانی بن گئیں
اُن سے کبھی گلیوں میں اب — ہوتا ہوں میں دوچار جب
نظریں جُھکا لیتا ہوں میں — خود کو چُھپا لیتا ہوں میں

کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

••

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

••

غزل

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے
ہو کر خرابِ مے ترے غم تو بھلا دیئے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے
ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبّت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے
ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے
کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے

●○

شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے اُمید کی لاش
مدّتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے
تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے
جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے

اور اب جب کہ مری روح کی پہنائی میں
ایک سنسان سی مغموم گھٹا چھائی ہے
تو دمکتے ہوئے عارض کی شعاعیں لے کر
گل شدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے

میری محبوب! یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا
میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھول چُنے تھے ترے قدموں کیلئے
اُن کا دھندلا سا تصوّر بھی مرے پاس نہیں

ایک تخ بستہ اُداسی ہے دل وجاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ اُمّید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی اُمنگوں کا خروش

ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا
بُجھ چکے ہیں مرے سینے میں محبت کے کنول
اب ترے حُسنِ پشیماں سے مجھے کیا لینا

تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو
میری افسردگیٔ غم کا مداوا تو نہیں
تیری محجوب نگاہوں کا پیامِ تجدید
اِک تلافی ہی سہی — میری تمنّا تو نہیں

●○

غزل

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم
مایوسیِ مآلِ محبّت نہ پوچھئے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم
لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید
لو اب کبھی گِلہ نہ کریں گے کسی سے ہم
اُبھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم
گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم
اللہ رے فریبِ مشیّت کہ آج تک
دُنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

کسی کو اُداس دیکھ کر

تمہیں اُداس سی پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اُٹھا رہی ہو تم
وہ شوخیاں، وہ تبسّم، وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تم
چُھپا چُھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تم

مری اُمید اگر مٹ گئی تو مٹنے دو
اُمید کیا ہے بس اک پیش و پس ہے کچھ بھی نہیں
مری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غمِ حیات غمِ یک نفس ہے، کچھ بھی نہیں
تم اپنے حُسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے، طولِ ہوس ہے کچھ بھی نہیں

مجھے تمہارے تغافل سے کیوں شکایت ہو؟
مری فنا مرے احساس کا تقاضا ہے
میں جانتا ہوں کہ دُنیا کا خوف ہے تم کو
مجھے خبر ہے، یہ دُنیا عجیب دُنیا ہے
یہاں حیات کے پردے میں موت ملتی ہے
شکستِ ساز کی آواز روحِ نغمہ ہے

مجھے تمہاری جُدائی کا کوئی رنج نہیں
مرے خیال کی دُنیا میں میرے پاس ہو تم
یہ تم نے ٹھیک کہا ہے تمہیں بلا نہ کروں
مگر مجھے یہ بتا دو کہ کیوں اُداس ہو تم؟
خفا نہ ہونا مری جُرأتِ تخاطب پر
تمہیں خبر ہے، مری زندگی کی آس ہو تم

مرا تو کچھ بھی نہیں ہے، میں رو کے جی لوں گا
مگر خدا کیلئے تم اسیرِ غم نہ رہو
ہوا ہی کیا جو زمانے نے تم کو چھین لیا
یہاں پہ کون ہوا ہے کسی کا، سوچو تو!
مجھے قسم ہے مری دُکھ بھری جوانی کی
میں خوش ہوں میری محبت کے پھول ٹھکرا دو

میں اپنی روح کی ہر اِک خوشی مٹا لوں گا
مگر تمہاری مسرت مٹا نہیں سکتا
میں خود کو موت کے ہاتھوں میں سونپ سکتا ہوں
مگر یہ بارِ مصائب اُٹھا نہیں سکتا
تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے میں اِک لحظہ پا نہیں سکتا

یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ

یہ شاہراہوں پہ رنگین ساریوں کی جھلک
یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زرد رو بچّے

گلی گلی میں یہ بِکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی
یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہیں اُٹھتی جوانیاں جنکی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دورِ مجبوری

یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اُداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

۱۹۴۶ء

غزل

ہوس نصیبِ نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب!
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت پہ اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گذار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

●○

میرے گیت

مرے سرکش ترانے سُن کے دُنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامۂ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خونریزی کے افسانوں سے رغبت ہے
مری دُنیا میں کچھ وقعت نہیں ہے رقص و نغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگِ بغاوت ہے

مگر اے کاش دیکھیں وہ مری پُرسوز راتوں کو
میں جب تاروں پہ نظریں گاڑ کر آنسو بہاتا ہوں
تصوّر بن کے بُھولی وارداتیں یاد آتی ہیں
تو سوز و درد کی شدّت سے پہروں تلملاتا ہوں
کوئی خوابوں میں خوابیدہ اُمنگوں کو جگاتی ہے
تو اپنی زندگی کو موت کے پہلو میں پاتا ہوں

میں شاعر ہوں، مجھے فطرت کے نظاروں سے اُلفت ہے
مرا دل دشمنِ نغمہ سرائی ہو نہیں سکتا
مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا
جواں ہوں میں، جوانی لغزشوں کا ایک طوفاں ہے
مری باتوں میں رنگِ پارسائی ہو نہیں سکتا

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مفلسوں کو، بیکسوں کو، بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو، تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدّد کو، امارت کے تکبّر کو
کسی کے چیتھڑوں کو، اور شہنشاہی خزانوں کو

تو دل تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

اشعار

ہر چند مری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبعِ خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداریِ احساس کے ہاتھوں
دُنیا مرے افکار کی دُنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گذر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارا نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

سوچتا ہوں

سوچتا ہوں کہ محبت سے کنارا کر لوں
دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوں

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جنونِ رُسوا
چند بے کار سے بیہودہ خیالوں کا ہجوم
ایک آزاد کو پابند بنانے کی ہوس
ایک بیگانے کو اپنانے کی سعیِ موہوم

سوچتا ہوں کہ محبت ہے سرور و مستی
اس کی تنویر سے روشن ہے فضائے ہستی

سوچتا ہوں کہ محبت ہے بشر کی فطرت
اس کا مِٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے
سوچتا ہوں کہ محبت سے ہے تابندہ حیات
آپ یہ شمع بُجھا دینا بہت مشکل ہے

سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں

سوچتا ہوں کہ محبت ہے اک افسردہ سی لاش
چادرِ عزت و ناموس میں کفنائی ہوئی
دورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہوئی

سوچتا ہوں کہ بشر اور محبت کا جنوں
ایسے بوسیدہ تمدن میں ہے اک کارِ زبوں

سوچتا ہوں کہ محبت نہ بچے گی زندہ
پیش از اں وقت کہ سڑ جائے یہ گلتی ہوئی لاش
یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ اُلفت ہو کر
اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش

اور سودائے محبت سے کنارا کر لوں
دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوں

ناکامی

میں نے ہر چند غمِ عشق کو کھونا چاہا
غمِ اُلفت غمِ دُنیا میں سمونا چاہا

وہی افسانے مری سمت رواں ہیں اب تک
وہی شعلے مرے سینے میں جواں ہیں اب تک
وہی بے سود خلش ہے مرے سینے میں ہنوز
وہی بے کار تمنّائیں جواں ہیں اب تک
وہی گیسو مری راتوں پہ ہیں بکھرے بکھرے
وہی آنکھیں مری جانب نگراں ہیں اب تک

کثرتِ غم بھی مرے غم کا مداوا نہ ہوئی
میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا
دل نے دُنیا کے ہر اک درد کو اپنا تو لیا
مضمحل روح کو اندازِ جنوں مل نہ سکا

میری تخئیل کا شیرازہ برہم ہے وہی
میرے بجھتے ہوئے احساس کا عالم ہے وہی
وہی بے جان ارادے، وہی بے رنگ سوال
وہی بے روح کشاکش وہی بے چین خیال

آہ! اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام، مری سعئ عمل بھی ناکام

مجھے سوچنے دے

میری ناکام محبّت کی کہانی مت چھیڑ
اپنی مایوس اُمنگوں کا فسانہ نہ سُنا
زندگی تلخ سہی، زہر سہی، سم ہی سہی
دردو آزار سہی، جبر سہی، غم ہی سہی
لیکن اس دردو غم و جبر کی وسعت کو تو دیکھ
ظلم کی چھاؤں میں دم توڑتی خلقت کو تو دیکھ
اپنی مایوس اُمنگوں کا فسانہ نہ سُنا
میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ
جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ
رہگذاروں پہ فلاکت زدہ لوگوں کے گروہ
بھوک اور پیاس سے پژمُردہ سیہ فام زمیں
تیرہ و تار مکاں، مُفلس و بیمار مکیں

نوعِ انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد
ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلاب عظیم
نت نئے طرز پہ ہوتی ہوئی دُنیا تقسیم
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں
اور دہقان کے چھپر میں نہ بتّی نہ دُھواں
یہ فلک بوس ملیں، دل کش و سیمیں بازار
یہ غلاظت پہ جھپٹتے ہوئے بھوکے نادار
دور، ساحل پہ وہ شفّاف مکانوں کی قطار
سرسراتے ہوئے پردوں میں سمٹتے گلزار
در و دیوار پہ انوار کا سیلاب رواں
جیسے اِک شاعرِ مدہوش کے خوابوں کا جہاں
یہ سبھی کیوں ہے؟ یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے
کون انساں کا خدا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے
اپنی مایوس اُمنگوں کا فسانہ نہ سُنا
میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ

اشعار

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

"حقیقت آشنائی" اصل میں گُم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ دانی
جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے ساقی

ہوس ہوگی اسیرِ حلقۂ نیک و بدِ عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مذاقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مِری ساغر میں مے ہے اور تِرے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پُر ہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیّام ہے ساقی

۰۰

صبح نوروز

پھوٹ پڑیں مشرق سے کرنیں
حال بنا ماضی کا فسانہ
گونجا مستقبل کا ترانہ
بھیجے ہیں احباب نے تحفے
اٹے پڑے ہیں میز کے کونے
دُلہن بنی ہوئی ہیں راہیں
جشن مناؤ سالِ نو کے

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اِک مُفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مُرجھائی ہوئی سی
جسم کے دُکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چُھپاتی
مُٹھی میں اِک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نَو کے

بھوکے زرد گداگر بچے
کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں
وقت سے پہلے جاگ اُٹھے ہیں
پیپ بھری آنکھیں سہلاتے
سر کے پھوڑوں کو کُھجلاتے
وہ دیکھو کچھ اور بھی نکلے
جشن مناؤ سالِ نَو کے

••

گریز

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی
اُن آرزوؤں پہ چھائی ہے گردِ مایوسی
جنہوں نے تیرے تبسم میں پرورش پائی
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جلا پائی
سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دماغ و دل میں ہے وحشت کی کار فرمائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی

سُلا گئی تھیں جنہیں تیری ملتفت نظریں!
وہ درد جاگ اُٹھے پھر سے لے کے انگڑائی
عجیب عالمِ افسردگی ہے رُو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا، نہ دل تمنّائی
تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب
مری اُداس طبیعت ہے سب سے اُکتائی
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپالے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مِل نہ سکی جنّتِ شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گذر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اُٹھا
اور اُس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی

وہ دیکھ سامنے کے پُر شکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بِکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جُھکا کسی در پر غرورِ برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اُٹھی
اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی
نہیں نہیں، مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی
مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی

کچھ باتیں

دیس کے ادبار کی باتیں کریں
اجنبی سرکار کی باتیں کریں

اگلی دُنیا کے فسانے چھوڑ کر — اس جہنّم زار کی باتیں کریں

ہو چکے اوصافِ پردے کے بیاں
شاہدِ بازار کی باتیں کریں

دہر کے حالات کی باتیں کریں — اس مسلسل رات کی باتیں کریں
من و سلویٰ کا زمانہ جا چکا — بھوک اور آفات کی باتیں کریں

آؤ پرکھیں دین کے اوہام کو
علمِ موجودات کی باتیں کریں

جابر و مجبور کی باتیں کریں — اس کہن دستور کی باتیں کریں
تاجِ شاہی کے قصیدے ہو چکے — فاقہ کشِ جمہور کی باتیں کریں

گرنے والے قصر کی توصیف کیا
تیشۂ مزدور کی باتیں کریں

۱۹۴۶ء

چکلے

یہ کوچے، یہ نیلام گھرِ دلکشی کے
یہ لُٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے؟

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پُر پیچ گلیاں، یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی، یہ سِکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے، یہ سودوں پہ تکرار

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

تعفن سے پُر نیم روشن یہ گلیاں!
یہ مسلی ہوئی اَدھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفس کی اُلجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے، یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں، جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابّا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے، ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمّت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

ذرا ملک کے رہبروں کو بُلاؤ
یہ گلیاں، یہ کوچے، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

طرحِ نو

سعیٔ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر
ماحولِ خشت بار میں شیشہ گری کی خیر
بیزار ہے کنشت و کلیسا سے اِک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر
فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام
سرمایہ کے فریبِ جہاں پروری کی خیر
طبقاتِ مبتذل میں ہے تنظیم کی نمود
شاہنشہوں کے ضابطۂ خودسری کی خیر
احساس بڑھ رہا ہے حقوقِ حیات کا
پیدائشی حقوقِ ستم پروری کی خیر

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر
صحنِ جہاں میں رقص کناں ہیں تباہیاں
آقائے ہست و بود کی صنعت گری کی خیر
شعلے لپک رہے ہیں جہنم کی گود سے
باغِ جناں میں جلوۂ حور و پری کی خیر
انساں اُلٹ رہا ہے رُخِ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نَو
دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

۵۵

تاج محل

تاج، تیرے لئے اِک مظہرِ اُلفت ہی سہی
تجھ کو اِس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب! کہیں اور مِلا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اُس پہ اُلفت بھری رُوحوں کا سفر کیا معنی؟

میری محبوب! اِس پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دُنیا میں محبّت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے
لیکن اُن کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مُفلس تھے

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں، یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
دامنِ دہر پہ اُس رنگ کی گُلکاری ہیں
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خون

میری محبوب! اُنہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اِسے شکلِ جمیل
اُن کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقّش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

●●

لمحۂ غنیمت

مسکرا اے زمینِ تیرہ و تار
سر اُٹھا اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پُرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم اُلجھنے لگے
کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار، سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی
آج موقع ہے، ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اُٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

۵۵

طلوعِ اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں

جاگے ہیں افلاس کے مارے، اُٹھے ہیں بے بس دُکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم آنکھوں میں بجلی کے شرارے

چوک چوک پر گلی گلی میں، سُرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت اُمڈے آتے ہیں

شاہی درباروں کے در سے، فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں

شور مچا ہے بازاروں میں، ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دُنیا، غصب شدہ حق انسانوں کے

رُسوا بازاری خاتونیں، حقِ نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں، سحر نوائی مانگ رہی ہیں

رَوندی کُچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اُٹھی ہے
دُنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اُٹھی ہے
جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکر بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر، ایک بھبھکتا شعلہ ہو کر
کاندھوں پر سنگین کدالیں ہونٹوں پر بیباک ترانے
دہقانوں کے دَل نکلے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے
آج پُرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
اُبھرے جذبے دب نہ سکیں گے، اُکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے
راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رُکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیلِ بے پایاں نہ رُکے گا
کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں، ٹوٹ گئے دل جبّاروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِّ الٰہی، مُنہ اُترے ہیں غدّاروں کے
ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

۴۶ء

شعاعِ فردا

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اُجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اُٹھے گا دلِ گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا

اور پھر ــــ احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر
اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل
ختم ہو جائے گی انساں کے لہو کی تقطیر

اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و سم افشاں سہی ۔ لیکن جی لے

بنگال

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو
نظامِ نَو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سِسک سِسک کے مرے

زمیں نے کیا اِسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوّا بِلک بِلک کے مرے

ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں
کہ دُخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اُس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو!
ملوں کے منتظمو، سلطنت کے فرزندو!

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے، دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

۱۹۴۵ء

فن کار

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دُکان پہ نیلام اُٹھے گا اُن کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبّت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تُلے گی ہر چیز
مرے افکار، مری شاعری، میرا احساس

جو تری ذات سے منسوب تھے اُن گیتوں کو
مُفلسی جنس بنانے پہ اُتر آئی ہے
بھوک تیرے رُخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنّائی ہے

دیکھ اِس عرصہ گہہِ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

آج اُن گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

●●

کبھی کبھی

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زُلفوں کی نرم چھاؤں میں
گذرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی

یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

عجب نہ تھا کہ میں بے گانۂ الم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

میں کارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں، ترا غم، تری جستجو بھی نہیں
گذر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گذر رہا ہوں کچھ انجانی رہگذاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پُر ہول خارزاروں سے

نہ کوئی جادہ، نہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس! مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

فرار

اپنے ماضی کے تصوّر سے ہراساں ہوں میں
اپنے گذرے ہوئے ایّام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمنّاؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود اُمیدوں پہ ندامت ہے مجھے

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی مری ذلّت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری اُمیدوں کا حاصل، مری کاوش کا صِلہ
ایک بے نام اذیّت کے سوا کچھ بھی نہیں

کتنی بے کار اُمیدوں کا سہارا لے کر
میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمنّاؤں کے مبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر

مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو کہ میں نے اُنہیں چاہا ہی نہیں
اور وہ مست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
میں نے ان مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں

مجھ کو کہنے دو کہ میں آج بھی جی سکتا ہوں
عشق ناکام سہی، زندگی ناکام نہیں
اُن کو اپنانے کی خواہش، اُنہیں پانے کی طلب
شوقِ بے کار سہی، سعیٔ غم انجام نہیں

وہی گیسو، وہی نظریں، وہی عارض، وہی جسم
میں جو چاہوں تو مجھے اور بھی مل سکتے ہیں
وہ کنول جن کو کبھی اُن کے لئے کھِلنا تھا
اُن کی نظروں سے بہت دور بھی کھِل سکتے ہیں

کل اور آج

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے

اور کوی نے سوچا تھا
بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے ہیں
دوشِ ہوا پر مے خانے ہی مے خانے گھر آئے ہیں
رُت بدلے گی، پھول کھلینگے، جھونکے مد برسائینگے
اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگیں آنچل لہرائیں گے

چرواہے بنسی کی دُھن سے گیت فضا میں بوئینگے
آموں کے جھُنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئینگے
پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکینگے
اُلجھی اُلجھی راہوں میں وہ آنچل تھامے آئینگے
دھرتی، پھول، آکاش، ستارے سپنا سا بن جائینگے
کل بھی بوندیں برسیں تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا

(۲)

آج بھی بوندیں برسیں گی
آج بھی بادل چھائے ہیں
اور کوئی اس سوچ میں ہے
بستی پر بادل چھائے ہیں، پر یہ بستی کس کی ہے؟
دھرتی پر امرت برسے گا، لیکن دھرتی کس کی ہے؟
ہل جوتے گی کھیتوں میں الھڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلے کے ڈھیر لگائینگے
جاگیروں کے مالک آکر سب "پونجی" لے جائینگے

بوڑھے دہقانوں کے گھر بنیے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائیگی
آج بھی جنتا بھوکی ہے اور کل بھی جنتا ترسی تھی
آج بھی رِم جھِم برکھا ہوگی، کل بھی بارش برسی تھی
آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوی اِس سوچ میں ہے

٥ ●

ہراس

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی وہ ہلکی سی لکیر
میری تخئیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے
یوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے

تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے
رات کی سرد خموشی میں ہر اک جھونکے سے
تیرے انفاس، ترے جسم کی آنچ آتی ہے

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں
لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اُجالے میں بیاں تو کر دوں
ان حسیں خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

سوچتا ہوں کہ تجھے مل کے میں جس سوچ میں ہوں
پہلے اس سوچ کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں
میں ترے شہر میں انجان ہوں پردیسی ہوں
تیرے الطاف کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں

کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے تھرا جائیں
اور تری مرمریں باہوں کا سہارا نہ ملے
اشک بہتے رہیں خاموش سیہ راتوں میں
اور ترے ریشمی آنچل کا کنارا نہ ملے

اسی دوراہے پر

اب نہ اِن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اِک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اپنی نادار محبت کی شکستوں کے طفیل
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی، جھنجھلائی تھی

اور یہ عہد کیا تھا کہ بہ ایں حالِ تباہ
اب کبھی پیار بھرے گیت نہیں گاؤں گا
کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا

پھر ترے کانپتے ہونٹوں کی فسوں کار ہنسی
جال بُننے لگی، بُنتی رہی، بُنتی ہی رہی
میں کھنچا تجھ سے، مگر تو مری راہوں کیلئے
پھول چُنتی رہی، چُنتی رہی، چُنتی ہی رہی

برف برسائی مرے ذہن و تصوّر نے مگر
دل میں اِک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چُپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پاکر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چُھپا
میں اِس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں
تیرے زرکار دریچوں کی بلندی کی قسم
اپنے اقدام کا مقسوم سمجھ سکتا ہوں

"اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا"
میں نے اِک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی جھنجھلائی تھی

●○

ایک تصویرِ رنگ

میں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تُو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حُسن کا نغمۂ جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبۂ بے تاب نظر آئی تھی

اے طرب زارِ جوانی کی پریشاں تتلی!
تو بھی اِک بوئے گرفتار ہے، معلوم نہ تھا
تیرے جلووں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تو ستم خوردۂ ادبار ہے معلوم نہ تھا

ترے نازک سے پروں پہ یہ زر و سیم کا بوجھ
تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دے گا
تو نے راحت کی تمنا میں جو غم پالا ہے
وہ تری روح کو آباد نہ ہونے دے گا

تو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کے لئے
اپنے دل، اپنی محبت کا لہو بیچا ہے
دن کی تزئین فسردہ کا اثاثہ لے کر
شوخ راتوں کی مسرت کا لہو بیچا ہے

زخم خوردہ ہیں تخیل کی اُڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری روح کے غم پلتے ہیں
سُرمگیں آنکھوں میں یوں حسرتیں لو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دیئے جلتے ہیں

اس سے کیا فائدہ ہے، رنگین لبادوں کے تلے
روح جلتی رہے، گھلتی رہے، پژمردہ رہے
ہونٹ ہنستے ہوں دکھاوے کے تبسم کیلئے
دل غمِ زیست سے بوجھل رہے آزردہ رہے

دل کی تسکین بھی ہے آسائشِ ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیست احساس بھی ہے، شوق بھی ہے درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

عمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری روح میں وسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دے دے
ایک لمحہ جو تری لے میں مسرت بھر دے

ایک شام

قمقموں کی زہر اُگلتی روشنی !
سنگ دل پُر ہول دیواروں کے سائے
آہنی بُت، دیو پیکر اجنبی
چیختی چنگھاڑتی خونیں سرائے

روح اُلجھی جارہی ہے، کیا کروں ؟

چار جانب ارتعاشِ رنگ و نور
چار جانب اجنبی بانہوں کے جال
چار جانب خوں فشاں پرچم بلند
میں، مری غیرت، مرا دستِ سوال
زندگی شرما رہی ہے، کیا کروں ؟

کارگاہِ زیست کے ہر موڑ پر
روحِ چنگیزی برافگندہ نقاب
تھام لے اے صبحِ جہانِ نو کی ضو!
جاگ اے مستقبلِ انساں کے خواب!
آس ڈوبی جا رہی ہے، کیا کروں؟

●○

میں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ تکلف، یہ دکھ، یہ حسرت کیوں؟
مری نگاہ طلب، آخری نگاہ نہ تھی

حیات زارِ جہاں کی طویل راہوں میں
ہزار دیدۂ حیراں فسوں بکھیر گئے
ہزار چشم تمنّا بنے گی دستِ سوال
نکل کے خلوتِ غم سے نظر اُٹھاؤ تو
وہی شفق ہے، وہی ضو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مرے بغیر بھی تم کامیابِ عشرت تھیں
مرے بغیر بھی آباد تھے نشاط کدے
مرے بغیر بھی تم نے دیئے جلائے ہیں
مرے بغیر بھی دیکھا ہے ظلمتوں کا نزول
مرے نہ ہونے سے اُمید کا زیاں کیوں ہو؟
بڑھی چلو مئے عشرت کے جام چھلکاتی
تمہاری سیج، تمہارے بدن کے پھولوں پر
اُسی بہار کا پرتَو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ اُداسی، یہ سوگ کیوں آخر؟
ملیح چہرے پہ گردِ فسردگی کیسی؟
بہارِ غازہ سے عارض کو تازگی بخشو
علیل آنکھوں میں کاجل لگاؤ، رنگ بھرو

سیاہ جوڑے میں کلیوں کی کہکشاں گوندھو
ہزار ہانپتے سینے، ہزار کانپتے لب
تمہاری چشمِ توجہ کے منتظر ہیں ابھی
جلو میں نغمہ و رنگ و بہار و نور لئے
حیات گرمِ تگ و دو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مجھے معلوم ہے انجام روودادِ محبّت کا
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعیٔ رائیگاں کر لوں

خودکشی سے پہلے

اُف! یہ بے درد سیاہی، یہ ہوا کے جھونکے
کس کو معلوم ہے اِس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اِک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
ڈوبتی آنکھوں میں پھر تابِ نظر ہو کہ نہ ہو

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیے
نیلگوں پردوں سے چھنتی ہیں شعاعیں اب تک
اجنبی باہوں کے حلقے میں لچکتی ہونگی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ردائیں اب تک

سرد ہوتی ہوئی بتی کے دھوئیں کے ہمراہ
ہاتھ پھیلائے بڑھے آتے ہیں بوجھل سائے
کون پونچھے مری آنکھوں کے سلگتے آنسو
کون اُلجھے ہوئے بالوں کی گرہ سُلجھائے

آہ! یہ غارِ ہلاکت، یہ دِیے کا محبس
عمر اپنی انہی تاریک مکانوں میں کٹی
زندگی فطرتِ بے حس کی پُرانی تقصیر
اِک حقیقت تھی مگر چند فسانوں میں کٹی

کتنی آسائشیں ہنستی رہیں ایوانوں میں
کتنے در میری جوانی پہ سدا بند رہے
کتنے ہاتھوں نے بُنا اطلس و کمخواب، مگر
میرے ملبوس کی تقدیر میں پیوند رہے

ظلم سہتے ہوئے انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

وہی ظلمت ہے فضاؤں میں ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو انساں کے لہو کی تقطیر
جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیے
آج میں موت کے غاروں میں اُتر جاؤں گا
اور دم توڑتی بتّی کے دھوئیں کے ہمراہ
سرحدِ مرگِ مسلسل سے گذر جاؤں گا

پھر وہی کنجِ قفس

چند لمحوں کیلئے شور اُٹھا، ڈوب گیا
کہنہ زنجیرِ غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیلِ بلا ہے، وہی دامِ امواج
ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی

ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعطّل کا فسوں
نبضِ اُمیدِ وطن اُبھری، مگر ڈوب گئی

پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پاکر
ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی

میرے محبوب وطن! تیرے مقدّر کے خدا
دستِ اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے، وہی تاریکی
پھر وہی کہنہ سلاسل، وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے، وہی بچّوں کی پکار
تیرے رہبر تجھے مرنے کیلئے چھوڑ چلے
ارضِ بنگال! انہیں ڈوبتی سانسوں سے پکار

بول! چٹگاؤں کی مظلوم خموشی! کچھ بول
بول اے پیپ سے رِستے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں
بول اے عصمت و عفت کے جنازوں کی قطار!
روک، ان لوٹتے قدموں کو انہیں پوچھ ذرا
پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار!

زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک؟
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک؟

●○

شملہ کانفرنس کی ناکامی پر لکھی گئی

یہ کِس کا لہُو ہے؟

(جہازیوں کی بغاوت ــــ ۱۹۴۶ء)

اے رہبرِ ملک و قوم! ذرا
آنکھیں تو اُٹھا، نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سُنیں، ہم کو بھی بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

دھرتی کی سلگتی چھاتی کے بے چین شرارے پوچھتے ہیں
تم لوگ جنہیں اپنا نہ سکے وہ خون کے دھارے پوچھتے ہیں
سڑکوں کی زباں چِلّاتی ہے، ساگر کے کنارے پوچھتے ہیں

یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟
اے رہبرِ ملک و قوم! بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

وہ کون سا جذبہ تھا جس سے فرسودہ نظامِ زیست ہلا
جھلسے ہوئے ویراں گلشن میں اِک آس اُمید کا پھول کھِلا
جنتا کا لہو فوجوں سے مِلا، فوجوں کا لہو جنتا سے مِلا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟
اے رہبرِ ملک و قوم! بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

کیا قوم و وطن کی جے گا کر، مرتے ہوئے راہی غنڈے تھے؟
جو دیش کا پرچم لے کے اُٹھے وہ شوخ سپاہی غنڈے تھے؟
جو بارِ غلامی سہہ نہ سکے، وہ مُجرمِ شاہی غنڈے تھے؟

یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟
اے رہبرِ ملک و قوم! بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

اے عزمِ فنا دینے والو! پیغامِ بقا دینے والو!
اب آگ سے کیوں کتراتے ہو؟ شعلوں کو ہوا دینے والو!
طوفان سے اب ڈرتے کیوں ہو؟ موجوں کو صدا دینے والو!
کیا بھول گئے اپنا نعرہ ؟
اے رہبرِ ملک و قوم! بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

سمجھوتے کی اُمید سہی، سرکار کے وعدے ٹھیک سہی
ہاں مشقِ ستم افسانہ سہی، ہاں پیار کے وعدے ٹھیک سہی
اپنوں کے کلیجے مت چھیدو، اغیار کے وعدے ٹھیک سہی

جمہور سے یوں دامن نہ چھڑا
اے رہبرِ ملک و قوم! بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں، ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو، ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہر منزلِ آزادی کی قسم، ہر منزل پر دہرائیں گے
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟
اے رہبرِ ملک و قوم! بتا
یہ کس کا لہو ہے، کون مرا؟

●○

میرے گیت تمہارے ہیں

اب تک میرے گیتوں میں اُمید بھی تھی پسپائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں، حال کی بوجھل ظلمت بھی
طوفانوں کا شور بھی تھا، اور خوابوں کی شہنائی بھی

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم، لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دوں گا
جیون کے اندھیارے پتھ پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلے آنچل میں سُرخ ستارے بھر دوں گا

آج سے اے مزدور کسانو! میرے گیت تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ شعلے خاموش نہ ہونگے
جب تک بے آرام ہو تم، یہ نغمے راحت کوش نہ ہونگے

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے، لوگ مجھے فن کار نہ مانیں
فکر و سخن کے تاجر، میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں
میرا فن، میری اُمیدیں، آج سے تم کو ارپن ہیں
آج سے میرے گیت تمہارے دُکھ اور سُکھ کا درپن ہیں

تم سے قوت لے کر اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا
تم پرچم لہرانا ساتھی! میں بربط پر گاؤں گا
آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

اشعار

نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات ساغرِ سم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بامِ حرم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
یہ اجتناب ہے عکسِ شعورِ محبوبی
یہ احتیاطِ ستم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
اِدھر بھی ایک اُچٹتی نظر کہ دُنیا میں
فروغِ محفلِ جم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
نئے جہان بسلئے ہیں فکرِ آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

●●

نور جہاں کے مزار پر

پہلوئے شاہ میں یہ دُخترِ جمہور کی قبر
کتنے گُم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خونریز حقائق سے اُٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کیلئے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کیلئے
سُرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

کیسے ہر شاخ سے مُنہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مُرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
"ظلِّ سُبحان" کی اُلفت کے بھرم کی خاطر

کیسے اِک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لُوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ہاتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد
اتنا خاموش ہے، فریاد کناں ہو جیسے
سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیسِ وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تو مری جان! مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نُور و جہانگیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے، ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں، زنجیر نہیں

جاگیر

پھر اُسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہوں!
جس میں پنہاں مری خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
میرے احباب کے سامانِ تعیّش کے لئے
شوخ سینے ہیں، جوان جسم حسیں باہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دُبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اِس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم و دلآویز اُبلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صِلہ لیتے ہیں
جانے اِن مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے اِن تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ان کی محنت بھی مری، حاصلِ محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوتِ بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اِس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری، نکہتِ گیسو بھی مری

میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں
ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
ان کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں ادھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

●●

مادام

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام؟
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہونگے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جِلا
ہم جہاں ہیں، وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں تو لوگوں پہ تعجب کیسا؟
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزّت کیسی
لوگ کہتے ہیں ۔ مگر آپ ابھی تک چُپ ہیں
آپ بھی کہئے، غریبوں میں شرافت کیسی؟

نیک مادام! بہت جلد وہ دَوْر آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہونگے
اپنی ذلّت کی قسم، آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہوں گے

ہم نے ہر دَوْر میں تذلیل سہی ہے، لیکن
ہم نے ہر دَوْر کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دَوْر میں محنت کے سِتم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دَوْر کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل؛
لوگ کہتے ہیں، تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میں جہاں ہوں وہاں انسان نہ رہتے ہونگے

●○

وجۂ بے رنگیِ گلزار، کہوں یا نہ کہوں
کون ہے کتنا گنہگار، کہوں یا نہ کہوں

●

مفاہمت

نشیبِ ارض پہ ذرّوں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید و سیاہ مِل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سِل ہی گئے

جہاد ختم ہوا دورِ آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شرابِ ہوس کے پیمانے

یہ جشن، جشنِ مسرت نہیں، تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اُخوّت بُجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے اُبھارے ہوئے حسیں فانوس

•

یہ شاخِ نور، جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گُل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اِک زہر چھوڑ جائے گی

••

بمبئی: ۱۵ اگست ۱۹۴۷

آج

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
چاند تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حُسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمہارا مُغنّی تمہارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں!

میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھُٹ گیا ہے
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں
میں تمہارا مغنّی ہوں، نغمہ نہیں ہوں
اور نغمے کی تخلیق کا ساز و ساماں
ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے
اور میں ــــ اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اُٹھی ہے
بربریّت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرّا رہے ہیں
بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے

اور میں اِس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں ــــــ
مجکو امن اور تہذیب کی بھیک دو،
میرے گیتوں کی لَے، میرے سُر، میری نَے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے
اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں
سرفروشی کے خوابیدہ جذبے اُبھارے
اور اُس صبح کی راہ دیکھی
جس میں اس ملک کی روح آزاد ہو

آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اِس ملک کے بحر و بر، بام و در
اجنبی قوم کے ظلمت افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں
کھیت سونا اُگلنے کو بے چین ہیں
وادیاں لہلہانے کو بیتاب ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
سنگ اور خشت بے خواب و بیدار ہیں
ان کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
ان کے خوابوں کو تکمیل کا روپ دو
ملک کی وادیاں، گھاٹیاں، کھیتیاں
عورتیں، بچّیاں ــــــ
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو اُن کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھے بچّوں کو اُن کی خوشی بخش دو
مُلک کی روح کو زندگی بخش دو

مُجکو میرا ہُنر میری لَے بخش دو
میرے سُر بخش دو، میری لَے بخش دو

آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اِس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے

دربدر پھر رہا ہوں
مُجکو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو
میں تمہارا مُغنّی ——— تمہارے لئے
جب بھی آیا، نئے گیت لاتا رہوں گا

●○

(اے، آئی، آر) دہلی
۱۱ ستمبر، ۱۹۴۷

غزل

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گذری؛
دلِ زندہ! ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری؛

زمیں نے خون اُگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری؛

ہمیں یہ فکر، اُن کی انجمن کس حال میں ہو گی؛
اُنہیں یہ غم کہ اُن سے چھُٹ کے دیوانوں پہ کیا گذری؛

مِرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا، سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری؛

یہ منظر کون سا منظر ہے، پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو، شبستانوں پہ کیا گذری؛

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے، لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری؟

(پاکستان)

نیا سفر ہے پُرانے چراغ گُل کر دو

فریبِ جنّتِ فردا کے جال ٹوٹ گئے
حیات اپنی اُمیدوں پہ شرمسار سی ہے
چمن میں جشنِ ورودِ بہار ہو بھی چکا
مگر نگاہِ گل و لالہ سوگوار سی ہے

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے
اُفق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہرِ منوّر، کہاں کی تنویریں
کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابنِ آدم نے
خرد گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکستِ تمنّا، وہی غمِ ایّام
نگارِ زیست نے سب کچھ لُٹا کے کیا پایا؟

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں
حریمِ شاہدِ رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہ گذر ختم ہو گئی ——— لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو
پُرانے راہنما لَوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوعِ صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دُلارے اِدھر نہ دیکھیں گے

ڈھونڈ رہی ہے حیات

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈھنے والے
یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں سُرمئی فضاؤں میں
افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں
پھر ایک منزلِ خونبار کی طرف ہیں رواں
وہ رہنما جو کئی بار راہ بھولے ہیں

بلند دعوئے جمہوریت کے پردے میں
فروغِ محبس و زنداں ہے، تازیانے ہیں
بنامِ امن ہیں جنگ و جدل کے منصوبے
بہ شورِ عدل، تفاوت کے کارخانے ہیں
دلوں پہ خوف کے پہرے، لبوں پہ قفلِ سکوت
سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

مگر مٹے ہیں کہیں جبر اور تشدّد سے
وہ فلسفے کہ جِلا دے گئے دماغوں کو
کوئی سپاہِ ستم پیشہ چھو نہ کر سکی
بشر کی جاگی ہوئی روح کے ایاغوں کو
قدم قدم پہ لہو نذر دے رہی ہے حیات
سیاہیوں سے اُلجھتے ہوئے چراغوں کو

رواں ہے قافلۂ ارتقائے انسانی
نظامِ آتش و آہن کا دل ہلائے ہوئے
بغاوتوں کے دُہل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جواں مشعلیں جلائے ہوئے
تمام ارضِ جہاں کھولتا سمندر ہے
تمام کوہ و بیاباں ہیں تلملائے ہوئے

مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار، کون روکے گا؟
فصیلِ آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا؟
نئے خیال کی پرواز روکنے والو!
نئے عوام کی تلوار کون روکے گا؟

پناہ لیتا ہے جن محبسوں کی تیرہ نظام
وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں
اُبھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں
ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اُٹھیں
وہ پھول کھِل کے رہیں گے جو کھِلنے والے ہیں

۱۹۴۸ء

غزل

جب کبھی اُن کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سرِ نو داستانِ شوق دُہرائی گئی

بک گئے جب تیرے لب، پھر تجھ کو کیا شکوہ اگر
زندگانی بادہ و ساغر سے بہلائی گئی

اے غمِ دُنیا! تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی

ہم کریں ترکِ وفا، اچھا چلو یونہی سہی
اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رُسوائی گئی؟

کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے
کیسے کیسے پیکروں کی شانِ زیبائی گئی

دل کی دھڑکن میں توازن آچلا ہے خیر ہو
میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی

اُن کا غم، اُن کا تصور، اُن کے شکوے اب کہاں
اب تو یہ باتیں بھی اے دل ہو گئیں آئی گئی

جرأتِ انساں پہ گو تادیب کے پہرے رہے
فطرتِ انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی

عرصۂ ہستی میں اب تیشہ زنوں کا دور ہے
رسمِ چنگیزی اُٹھی، توقیرِ دارائی گئی

●○

متاعِ غیر

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدّر میں سحر ہے کہ نہیں

چار دن کی یہ رفاقت، جو رفاقت بھی نہیں
عمر بھر کے لئے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے

میری اُجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی، کبھی غیر نظر آتی ہے
کبھی اخلاص کی مورت کبھی ہرجائی ہے

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی
تو بتادے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسّم سے جگایا ہے جنہیں
ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے، لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو، ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں، مری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

تیرے ہاتھوں کی حرارت، ترے سانسوں کی مہک
تیرتی رہتی ہے احساس کی پہنائی میں
ڈھونڈھتی رہتی ہیں تخئیل کی باہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

تیرا اندازِ کرم ایک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت بھی حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
تری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا اِک اور بہانہ ہی نہ ہو

کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے؟
قربتیں بڑھ کے پشیمان بھی ہو جاتی ہیں
دل کے دامن سے لپٹتی ہوئی رنگیں نظریں
دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمناؤں کے
مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں ویرانے بھی
میرا حاصل ۔ مری تقدیر بتا دے مجھ کو

آوازِ آدم

دبے گی کب تلک آوازِ آدم ہم بھی دیکھیں گے
رُکیں گے کب تلک جذباتِ برہم ہم بھی دیکھیں گے
چلو یونہی سہی، یہ جورِ پیہم ہم بھی دیکھیں گے
درِ زنداں سے دیکھیں یا عروجِ دار سے دیکھیں
تمہیں رُسوا سرِ بازارِ عالم ہم بھی دیکھیں گے
ذرا دم لو، مآلِ شوکتِ جم ہم بھی دیکھیں گے

رات کی سطح پہ اُبھرے تری چہرے کے نقوش
وہی چُپ چاپ سی آنکھیں وہی سادہ سی نظر
وہی ڈھلکا ہُوا آنچل، وہی رفتار کا خم
وہی رہ رہ کے لچکتا ہوا نازک پیکر

تو مرے پاس نہ تھی پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس مرے جسم کو چھو کر گذرا
قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطر گذرا

اب یہی ہے تجھے منظور تو اے جانِ قرار
میں تری راہ نہ دیکھوں گا سیہ راتوں میں
ڈھونڈھ لیں گی مری ترسی ہوئی نظریں تجھ کو
نغمہ و شعر کی اُمڈی ہوئی برساتوں میں

اب ترا پیار ستائے گا تو میری ہستی
تیری مستی بھری آواز میں ڈھل جائیگی
اور یہ روح جو تیرے لئے بے چین سی ہے
گیت بن کر ترے ہونٹوں پہ مچل جائے گی

تیرے نغمات، ترے حسن کی ٹھنڈک لے کر
میرے تپتے ہوئے ماحول میں آجائیں گے
چند گھڑیوں کے لئے ہو کہ ہمیشہ کیلئے
میری جاگی ہوئی راتوں کو سُلا جائیں گے

٥٥

غزل

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم
کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم
لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم
مانا کہ اِس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے، گذرے جدھر سے ہم

۵۵

خوبصورت موڑ

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

نہ میں تم سے کوئی اُمید رکھوں دلنوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے

معیار اور حسن
قائم رکھنے والا ادارہ
چند اور اچھی ناول پیش کرتا ہے

سرخ و سیاہ	استاں دال	١١-٠-٠
مادام بوواری	فلوبیر	٦-٠-٠
میری بھی صنم خانے	قرۃالعین حیدر	٦-٠-٠
سفینۂ غم دل	قرۃالعین حیدر	٥-٠-٠
شبنم	عزیزاحمد	٤-٨-٠
ایسی بلندی ایسی پستی	عزیز احمد	٤-٠-٠
بڈھا گوریو	بالزاک	٦-٠-٠
کنواری کھیت	شولوخوف	٦-٠-٠
زرد پتا	انور جلال	٦-٠-٠

مکتبہ جدید : لاہور

سویرا آرٹ پریس، لاہور